ادیب سہیل

فسانۂ خورشیدی

عرصہ دراز سے مجھے سید افضل الدین احمد کے ناول ''فسانۂ خورشیدی'' کی تلاش تھی۔ کراچی کی لائبریریاں چھان ماریں۔ ۱۸۸۶ء کا شائع شدہ یہ ناول بھلا کس کو یاد ہوگا۔ آج تو ایسا شخص بھی مشکل سے ملے جو یہ کہہ سکے کہ یہ ناول اس کی نظر سے گزرا ہے۔ قدیم کتب تحقیق میں اس کا ذکر اس طرح ملتا ہے کہ ایک صاحب افضل الدین احمد نے ایک ناول ''فسانۂ خورشیدی'' لکھا تھا۔ بعض کو یہ بھی پتا نہ تھا کہ یہ ناول اپنے دور میں اتنا مقبول تھا کہ اس کے کئی ایڈیشن بازار میں آئے۔ یہ وہ دور تھا جب اردو میں ابھی ناول نگاری گھٹنوں کے بل رینگ رہی تھی۔ لے دے کے ڈپٹی نذیر احمد کا ایک ناول ''مراۃ العروس'' (۱۸۶۹ء) کا چرچا سرفہرست تھا۔ اس کے عقب اور آس پاس کچھ اور چھوٹے بڑے ناول لکھے گئے۔ جن میں مولانا حالی کا ''مجالس النساء''، شاد عظیم آبادی کا ناول ''صورت الخیال عرف ولایتی بیگم'' (۱۸۷۶ء) رشید النساء کا ناول ''اصلاح النساء'' (۱۸۸۱ء) کا شمار ہوتا ہے۔

ناول نگاری کا فن ہمارے ہاں مغرب سے آیا ہے۔ اس لیے اس طور کے برتاوے کے لیے شادؔ کو دوسری جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے دو راستے تھے ایک تو یہ کہ براہ راست انگریزی ناولوں سے رجوع کیا جائے، دوسرے اس کی متبادل صورت یہ تھی کہ بنگلہ ناولوں کے نمونے دیکھے جائیں۔ کیونکہ بنگلہ ناول کا محرک بھی انگریزی ناول تھے لیکن اپنی مٹی سے جڑے ہوئے اور دھرتی رس لیے ہوئے بنگلہ ناول نگاری کی عمر اس وقت تک پچہتر برس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ بنگلہ ادب میں ۱۷۹۵ء۔۹۷ء میں ناول لکھے جا چکے تھے۔

عام تشہیر کے مطابق ناول ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں منظر عام پر آیا اس

اطلاع کے ساتھ کہ یہ اردو کا پہلا ناول ہے (حالانکہ سید حسن شاہ کا ناول ''نشتر'' اس سے بہت پہلے شہرت پا چکا تھا۔ اسے قرۃ العین حیدر نے ناول ہی مانا ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو ناول نگاری کا آغاز تقریباً پچھتر برس پہلے ہوا اور کسی فن کو پنپنے اور پختہ ہونے کے لیے اتنا وقت بہت ہے۔

شاؔد نے اپنے سامنے بنگلہ کا مشہور ناول ''اندرا'' رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''صورت الخیال'' جب لکھا گیا تو بہت حد تک اپنے پیش رو ناول ''مراۃ العروس'' سے مختلف اور برتاوے (Treatment) میں کسی حد تک جدید تھا۔ موقع ومحل کے لحاظ سے ماجرا کاری اور فضابندی کے اعتبار سے یہ جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ پھر شاؔد نے کئی برس بعد ایک اور ناول ''افیونی'' تحریر کیا۔ جس میں داستان گوئی کی تکنیک اپنائی گئی لیکن اس ناول کا پس منظر پریوں کا دیس اور شاہزادوں کے ذکر پر مبنی نہ تھا۔ عصری حسیت سے مملو تھا۔ پٹنہ شہر، اس کا ماحول، اس کا معاشرہ، تہذیب اور معاشرتی احوال الگ الگ ابواب میں رقم ہوئے ہیں۔ اس ناول کے مرتب کے مطابق یہ ناول سولہ ابواب میں منقسم تھا لیکن گیارہ ابواب میں شائع ہوا۔ پانچ ابواب دیمک کی نذر ہو چکے تھے۔ افیونی کی تکنیک کی خوبی یہ ہے کہ یہ ناول پھر بھی مکمل ہونے کا تاثر پیش کرتا ہے۔ تاحال اس ناول کے ذکر سے محققین کے مضامین خالی ہیں۔ اس بے خبری کے اسباب کیا ہیں یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔

ادبی تاریخ کے سیاق وسباق سے پتا چلتا ہے کہ بہار میں ۱۸۵۰ء سے ۱۹۱۱ء تک کم وبیش بتیس چھوٹے بڑے ناول وناولٹ لکھے گئے۔ انھیں میں ایک زبان زد خلائق، سید افضل الدین احمد کا ناول ''فسانۂ خورشیدی'' ہے۔ جس کے لیے ''زندگانی بے نظیر'' کے مصنف عبدالغفور شہباز نے ۱۸ جولائی ۱۸۸۵ء کو دیباچہ لکھا۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ خان بہادر افضل الدین احمد نے یہ ناول چند سال پہلے لکھنا شروع کیا ہوگا۔ اس لیے کہ ضخیم ناول لکھنے کے لیے پہلے ذہن سازگار بنانا ہوتا ہے۔ بعد ازاں وہ

جستہ جستہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہونے لگتا ہے۔ یہ کاتا اور لے دوڑی کا عمل نہیں، رسان رسان سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ جب یہ ناول مکمل ہو چکتا ہے تو نظر ثانی کا مرحلہ آتا ہے، پھر طباعت کا۔ کوئی شوم قسمت ناول کا مسودہ برسوں طباعت کی راہ بھی دیکھتا رہ جاتا ہے۔

یہاں نواب امداد امام اثر کی سگی بہن رشید النساء کے ناول ''اصلاح النساء'' (۱۸۸۱ء) کا ذکر ضروری ہے کہ وہ فسانۂ خورشیدی سے پہلے معرض وجود میں آیا۔ اس کا اختصاص یہ ہے کہ اس کی بدولت رشید النساء اردو کی پہلی ناول نگار خاتون مانی جاتی ہیں۔

عبدالغفور شہباز نے ''فسانۂ خورشیدی'' کے دیباچے میں اس ناول کا محل وقوع کلکتے کو بتایا ہے اور اس ناول کے اہم ترین کردار نواب محتشم الدولہ کو کلکتے کے ایک محلہ و مقام خضر پور کا ذی وقار و بارسوخ شخص قرار دیا ہے۔ کلکتہ کے بیچ سے دریائے ہگلی گزرتا ہے۔ ہگلی کے اس طرف کا تمام حصہ کلکتہ کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس کے اس پار کے حصے کو ہوڑہ کہا جاتا ہے، خضر پور بھی اس پار کا ہی حصہ ہے۔ اسی خضر پور میں مٹیا برج کا علاقہ واقع ہے جہاں انگریز حکمران سلطان واجد علی شاہ کو ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے جلا وطن کر کے لایا اور نظر بند کیا، بعد میں یہی علاقہ جان عالم سلطان واجد علی شاہ کا مستقر ٹھہرا۔ اور بہ مرور وقت مٹیا برج کو باغات اور عمارات سے اس سج دھج سے آراستہ کیا گیا کہ دوسرے تو دوسرے خود مولانا عبدالحلیم شرر نے اس نو تعمیر شہر (مٹیا برج) کو دیکھ کر اسے چھوٹے لکھنؤ سے تعبیر کیا تھا۔

دراصل واجد علی شاہ جب لکھنؤ سے جلا وطن ہو کر کلکتے کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ مصاحبین و مقربین خاص بھی وہاں سے اکھڑ کر مٹیا برج چلے آئے، درباری موسیقار آئے، مختلف نام اور عنوان سے شہرت رکھنے والے رقاص اور رقاصاؤں کے طائفے شاہ کی معیت میں چل پڑے پھر یہ آنے کا سلسلہ ایسا بندھا کہ مٹیا برج ''منی لکھنؤ'' کا منظر پیش کرنے لگا۔ مولانا شرر کی تصنیف ''جان عالم'' اس دور کی عینی شاہد کا درجہ

رکھتی ہے۔

ناول ''فسانۂ خورشیدی'' کے مصنف سید افضل الدین احمد کا اس کے لیے محل وقوع کا انتخاب کلکتے کی نواحی بستی مٹیا برج بڑا موزوں لگا۔ ناول کا جو تانا بانا ان کے ذہن میں تھا، اس کے لیے مٹیا برج ہی موزوں ہو سکتا تھا۔ کلکتہ مصنف کا ہر چہار طرف سے دیکھا بھالا تھا اور وطن ثانی کا درجہ رکھتا تھا۔

سید افضل کی پیدائش ناڑھ (ضلع پٹنہ) نواب کوٹھی میں ہوئی تھی لیکن بہ قول ڈاکٹر آصفہ واسع مصنفہ ''بہار میں اردو ناول نگاری'' سید افضل کے اوائل عمر کا کچھ حصہ کلکتہ میں اپنے والد کے ذاتی مکان میں گزرا جو مہدی باغ، رپن اسٹریٹ میں تھا۔ آج کل اس میں فرنچ موٹر کمپنی ہے۔ موصوف نے کلکتہ ہی میں تعلیم پائی، انٹرنس پاس کرنے کے بعد ڈفٹن کالج کلکتہ میں داخل ہوئے۔ پڑھنے لکھنے سے انھیں خاص شغف تھا۔ انگریزی کی اچھی صلاحیت تھی۔ فارسی بھی جانتے تھے............'' سرکار انگلشیہ کے دور میں وہ کلکتہ ہی میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔

سید افضل الدین صاحب کے والد ماجد کا نام نواب امیر علی اور خطاب خان بہادر تھا۔ سید ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

''عہد انگلشیہ میں بنگال کے مسلمانوں کی قومی واجتماعی زندگی پر جن شخصیتوں نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں ان میں نواب امیر علی خان بہادر کا نام بڑی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے متعلق سر رچرڈ ٹمپل جیسے مدبر کی رائے یہ تھی کہ انھوں نے سالار جنگ کے بعد نواب امیر علی خان بہادر جیسے دل ودماغ کا انسان ہندوستانی مسلمانوں میں نہیں پایا......''

ناول ''فسانۂ خورشیدی'' دو حصوں میں بٹا ہوا ہے پہلا حصہ ۳۵۴ صفحات اور دوسرا حصہ ۲۲۷ صفحات پر مشتمل ہے، دونوں مل کے تین نسلوں کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ ناول کے آخر میں منظوم ومنثور تقاریظ ۳۲ صفحات کو محیط ہیں۔ کتاب کا آغاز منظوم دیباچے سے ہوتا ہے جو ۱۶۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ جس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

کیوں نہ مقبول ہو مری تحریر
زیب عنواں ہے حمد رب قدیر

اور اختتام اس شعر پہ ہوتا ہے:

عیب پوشی کو کام فرمائیں
کہ خطا سے بشر کی ہے تخمیر

اس منظوم دیباچے سے خان بہادر افضل الدین احمد کے اعلیٰ ذوق شعری کی شہادت بھی ملتی ہے۔

کتاب میں کتابت کے لیے جلی خط استعمال کیا گیا ہے اور کتابت چودہ سطری ہے۔ کتاب زیر بحث سید ابوالعاص صاحب کی مملوکہ ہے جو پٹنے کی مشہور مسلم لیگی شخصیت تھے۔ کتاب کی درونی، بیرونی شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی سخت جان اور زمانہ چشیدہ ہے۔ دیمک کے حملوں کے باوجود محفوظ رہ گئی ہے۔ اس کے کچھ منظر نامے کو مصور کر کے اس میں اضافی دلچسپی کا سامان پیدا کیا گیا ہے۔ عرصہ دراز تک ''فسانہ خورشیدی'' کا یہ مطبوعہ نسخہ ڈاکٹر مطیع الرحمٰن کی ذاتی لائبریری میں پڑا رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے فارسی زبان میں بیدل عظیم آبادی پر ایران سے ڈاکٹریٹ مکمل کیا تھا۔ چند برس ادھر طویل علالت کی وجہ سے ڈاکٹر مطیع الرحمٰن کا انتقال ہوگیا۔ ان کی ذاتی لائبریری ان کے داماد ڈاکٹر سید قیصر امام کو ورثے میں ملی۔ پیشے کے اعتبار سے سید قیصر امام اگرچہ طبیب ہیں لیکن ادب کا ذوق ان کو اپنے علمی خانوادے سے ملا ہے۔ اس خانوادے کے بزرگوں میں شمس العلماء نواب سید امداد امام اثر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر قیصر امام کے دادا سید یوسف امام نواب اثر کے سگے چھوٹے بھائی تھے۔ رشید النساء مصنفہ ناول اصلاح النساء (۱۸۸۱ء) نواب اثر و یوسف امام کی سگی بہن تھیں اور ان تینوں کے والد بزرگوار شمس العلماء مولوی سید وحید الدین ''حدِ تحقیق'' کے مصنف تھے۔

حال ہی میں ڈاکٹر قیصر امام نے اپنے دادا یوسف امام کی بہن رشید النساء کا

ناول ''اصلاح النساء'' اوراپنے بڑے بھائی ڈاکٹر اختر امام ہفت زبان اسکالر کے مکتوبات ''مکتوبات اختر امام'' کے نام سے شائع کیے ہیں۔ساتھ ہی ایک اور کارنامہ انجام دیا ہے کہ اپنے بڑے دادا شمس العلماء نواب سید امام اثر کی معرکہ آرا تصنیف ''مراۃ الحکما'' (۱۸۷۷ء) جو نایاب تھی اسے خدا بخش لائبریری پٹنہ سے منگواکر چھاپ دیا ہے جو انیسویں صدی کے اواخر ہی سے سویڈن میں ترجمہ ہوکر وہاں کی اعلی درسگاہ میں پڑھائی جانے لگی تھی۔

ناول ''فسانۂ خورشیدی'' انھیں ڈاکٹر قیصر امام کی لائبریری سے دستیاب ہوا ہے، انھیں پتا تھا کہ میں ایک طویل مدت سے ''فسانۂ خورشیدی'' کی جستجو میں ہوں چنانچہ انھوں نے ازراہ عنایت میرے حوالے کردیا ہے میں اس نعمت غیر مترقبہ کو پاکر بے حد خوش ہوں۔

مطالعے میں یہ ناول اس قدر دلچسپ ثابت ہوا کہ جب شروع کیا تو پھر اسے ختم کرکے ہی چھوڑا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ''فسانۂ خورشیدی'' اپنے دور کے حساب سے نہایت جدید سوچ کا حامل ناول ہے۔تعلیم وتہذیب وحقوق نسواں کے باب میں یہ ایک انقلابی قدم ہے، وسعت نظری کی دعوت دیتا ہے اور آنکھیں کھولنے کے مترادف ہے۔اسے پڑھتے ہوئے بے ساختگی کا احساس ہوتا ہے۔پانچ سوصفحات کا یہ ناول مکالمے سے شروع ہوتا ہے اور مکالمے پرختم ہوجاتا ہے۔ناول نگار کی زبانی بیان واقعہ برائے نام ہے۔ناول کے سارے واقعات وواردات، اس کے موڑ، پیچ وخم اور نشیب وفراز کرداروں کے زبان وعمل سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔طرز اظہار کا یہ طریقہ یقینی ایک تخصیص کا حامل ہے۔مسائل کے معاملے میں اس کا اپروچ مبنی برحقائق، اقتضائے وقت سے جڑا ہوا اور عصری حسیت کا مظہر ہے آج بھی جب کہ انواع واقسام کے ناول لکھے جا رہے ہیں، اس ہجوم میں مقصد کے اعتبار سے اب بھی یہ ''Feminine کاز'' کی نمائندگی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔آپ سوا سو سال ادھر کو سامنے رکھیں جب عورتیں اس

معاشرے میں جی رہی تھیں کہ ناول کی قسم کی کتاب اپنے اہل خانہ کے مرد یا بزرگ افراد سے نظریں بچا کر پڑھا کرتی تھیں، اگر خواتین پر لاگو اس قدغن کو پیش نظر رکھیں تو یقیناً افضل الدین احمد کا یہ ناول ایک بڑا اجرأت مندانہ اور بروقت اقدام تھا اور عورتوں کے باب میں نشاۃ ثانیہ مرتب کر رہا تھا۔

''فسانۂ خورشیدی'' کے کرداروں کے مکالمات میں کہیں کسب کی صورت نہیں ابھرتی، مکالمات کی پڑھت میں زور زبردستی کا احساس نہیں ہوتا نہ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیان کو کھینچ تان کر مکالمات کے چوکھٹے میں بند کیا گیا ہو۔ کہانی کی پیش رفت نہایت فطری معلوم ہوتی ہے اور پیش کش ایسی کہ اس سے اوبنے کی کیفیت کہیں پیدا نہیں ہوتی سوائے ایک مقام پر جہاں مولوی عبدالستار، نواب آسماں جاہ کے نئے طرز لباس اور وضع اکل و شرب کے خلاف باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور ناصح مشفق بن کر ظاہر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

خان بہادر افضل احمد نے اپنے ناول ''فسانۂ خورشیدی'' کے ذریعے روشن خیالی کے مشن کو خوبصورتی سے آگے بڑھایا ہے۔ اس سے قارئین کو جو درس ملتا ہے وہ یہ کہ تازہ ہوا مغرب کی ہو یا مشرق کی اس سے منہ پھیر کر چلنا مناسب نہیں۔ یہاں وہ حالی اور ان کے دوسرے ترقی پسند عناصر کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔

ناول ''فسانۂ خورشیدی'' اس لحاظ سے بھی اہمیت و اولیت کا حامل ہے کہ تعلیم نسواں، حقوق نسواں اور Emancipation of woman کی ضرورت اس کے پیکر میں سلیقے سے بیان ہو گئی ہے۔ یہاں ناول کے اہم کردار بلکہ کلیدی کردار نواب محتشم الدولہ کو نہیں بھولنا چاہیے جو اپنے زمانہ شناش، دوررس اور ترقی پسند خیالات کی وجہ سے پورے ناول پر چھتر کی طرح موجود ہیں۔ ان کی یہ روشن خیالی باہری تعلیم اور سیر و سیاحت کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی خورشیدی بیگم اور اس کی ہم عمر خالہ زاد بہن مشتری بیگم کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے مس ٹامسن کو ان کی

اتالیق مقرر کیا ہے۔

مس ٹامسن اس طرح نواب محتشم الدولہ کے پورے خاندان کی اتالیق بن گئی تھیں۔انھوں نے خورشیدی بیگم کو اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اس کے طبعی رجحان (apptitude) کو دیکھتے ہوئے اسے فن مصوری کی طرف بھی لگایا۔اور پھر خورشیدی بیگم اپنی ذہانت اور فطری لگاؤ کی وجہ سے اس فن میں اتنی تیز بڑھی کہ ایک عالمی نمائش میں بہت سی ہاتھ سے بنائی ہوئی تصاویر کے درمیان خورشیدی کی تصویر اول انعام کی مستحق ٹھہری۔گورنر بنگال نے اسے انعام سے نوازا۔

ناول میں مس ٹامسن نواب محتشم الدولہ کے بعد دوسری اہم اور مددگار کردار ہیں جو ناول کی بنت میں ہر مقام پر اپنا کردار ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ایک طرف انھوں نے خورشیدی بیگم اور ان کی خالہ زاد بہن مشتری بیگم کو نئی تعلیم سے آراستہ کیا۔دوسری طرف اب سے چند سال پیشتر نواب آسماں جاہ اور نواب تقی خاں کو بھی ابتدا تعلیم دی جو بعد میں بی۔اے، ایم۔اے کر کے اعلی تعلیم سے آراستہ نوجوان کہلائے۔وہ نواب محتشم الدولہ کے آمور خانہ میں بھی دخیل تھیں انھوں نے نواب آسماں جاہ اور خورشیدی بیگم کے طبعی میلان کو دیکھ کر ان دونوں کی منگنی کی سفارش کی۔نواب محتشم الدولہ نے اس صائب مشورہ کو بہ سر وچشم قبول کیا اور اس کے لیے وہ مس ٹامسن کے احسان مند بھی ہوئے جو نواب محتشم الدولہ کے بیرون ملک اعلی تعلیم کے توسط سے ان تک پہنچی تھی۔عین ممکن ہے کہ خان بہادر افضل الدین احمد بجائے کلکتے کے کہیں اور بیٹھ کر یہ ناول لکھنے کا منصوبہ بناتے تو شاید اس کا منظر نامہ کچھ اور ہوتا۔وہ یہ ہوتا جواب ''فسانۂ خورشیدی'' کی صورت میں دیکھ رہے ہیں، روشن خیالی اور نئی اقدار کو قبول کرنے کے ضمن میں کھلا مرقع ! ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اسی کلکتہ کے سفر (۱۸۲۸ء میں) نے مرزا غالب کی روشن خیالی کو بھی آسانی عطا کی۔

ناول کی کہانی میں ایک واقعہ یا ایک واردات دوسرے واقعے یا واردات سے

اس طرح جڑتا چلا جاتا ہے جیسے اسے بالکل اسی عنوان سے جڑنا تھا۔ شاید ہی کہیں مکالمات غیر ضروری تقریر بن پائے یا خطیبانہ (Rhetoric) ہوئے۔ فطری انداز سے اپنا سفر کرتے رہے ہیں، ایک خاص بے ساختہ پن کے ساتھ!

''زندگانی بے نظیر'' (۱۸۰۰ء) کے مصنف عبدالغفور شہباز ''فسانۂ خورشیدی'' کے دیباچے (۱۸۸۵ء) میں لکھتے ہیں:

> ''اس افسانے (فسانۂ خورشیدی) میں جس کا محل وقوع کلکتہ ہے، حسن وعشق سے بحث کی ہے۔ مگر پیرایہ جدید دلربائی و دل دادگی کو بیان کیا ہے لیکن بہ طرز نو۔ خورشیدی بیگم کے حسن صورت کو، حسن تعلیم، حسن عادات، حسن اخلاق وغیرہ خوبیوں سے مرصع کر کے آسماں جاہ کے لیے دلربائی کا ایک بے ساختہ عبادت طلب، خواہ مخواہ پرستش طلب پتلا بنا دیا ہے''

اسی دیباچے میں شہباز صاحب مس ٹامسن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مس ٹامسن جن کا فیض تعلیم چاروں عاشق ومعشوق کو اپنے کنار تربیت وشفقت میں لیے ہوئے ہے اور جن کے حسن سعی سے چاروں کا باہم وصال ہوا، خاص توجہ کی مستحق ہیں''

جناب عبدالغفور شہباز کی عبارت چاروں عاشق ومعشوق .... کا اشارہ نواب آسماں جاہ اور خورشیدی بیگم اور نواب تقی خاں اور مشتری بیگم کی طرف ہے۔ یہ دونوں جوڑے بہ مرور زمانہ رشتۂ مناکحت میں بندھ گئے۔ اس رشتے کو عملی جامہ پہنے میں مس ٹامسن کی پسندیدگی اور مساعی کو خاص دخل ہے کہ یہ چاروں بہ قول شہباز انھیں خاتون کے کنارِ تربیت کے پروردہ ہیں ان رشتوں کے پنپنے اور عملی جامہ پہننے میں نواب محتشم الدولہ کی روشن خیالی اور بردباری کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ یہاں روشن خیالی کے حوالے سے مشتری بیگم کے نواب تقی خاں کے ساتھ عقد ثانی کا ذکر ضروری

ہو جاتا ہے۔ مشتری بیگم عقد اول کو بھول بھی نہ پائیں اور بیوہ ہو گئیں۔ اس وقت کے معاشرے میں جب ابھی بیوہ کی شادی کو معیوب سمجھا جاتا تھا اور کوئی اس بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ بڑی بوڑھیاں اس کے نام پر کان پر ہاتھ دھر لیتی تھیں۔ نواب محتشم الدولہ نے بیوہ کے عقد ثانی کو مذہب کی رو سے درست اور انسانی تقاضے کے اعتبار سے مرجح گردانا اور مشتری بیگم کو بلکہ پورے خاندان کو ایک مثالی سرخوشی سے آشنا کیا۔ ساتھ ہی معاشرے کے دوسرے خاندانوں کے لیے ایک نظیر قائم کی۔

اب ذرا علی عباس حسینی کی تصنیف 'ناول کی تاریخ وتنقید' میں فسانۂ خورشیدی کے بارے میں کیا کچھ کہا گیا ہے اس کا جائزہ لیا جائے۔ وہ افضل الدین کے اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''فسانۂ خورشیدی'' ناول کے ڈھنگ پر ہے اور ناول ہی کے نام سے لکھا گیا ہے۔

علی عباس حسینی صاحب پہلے تو اپنی کتاب مذکور میں جہاں ''فسانۂ خورشیدی'' پر آراء کا اظہار کرتے ہیں وہاں آغاز یے کے طور پر مولوی عبدالغفور شہباز کے دیباچے کا کچھ حصہ نقل (Reproduce) کرتے ہیں یہ سلسلہ ۲۱۲ تا ۲۱۵ صفحات تک چلتا رہتا ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں:

> ''.......... یہاں تک تو ہم مولانا شہباز کے ہم نوا تھے لیکن جہاں سے وہ فسانۂ خورشیدی کی تعریفوں کا پل باندھتے ہیں ہم کو ان سے اختلاف ہے۔ فسانۂ خورشیدی محض ایک رومانی ناول ہے جس کے اکثر کردار مثالی ہیں، ان میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی وجہ سے وہ ادب میں زندہ جاوید بن سکیں''
>
> (ناول کی تاریخ وتنقید۔ صفحہ ۲۱۵)

علی عباس حسینی صاحب کے تعریفوں کے پل باندھنے والے جملے کو پڑھ کر میں چونک گیا اور شہباز صاحب کی تقریظ کو پھر سے پڑھا۔ مجھے اس تقریظ میں ایسا پل کہیں نظر نہ

آیا۔ ''زندگانی بے نظیر'' کا مصنف اور کھرا تنقیدی رویہ رکھنے والا شخص ایسی کمزور باتیں کیسے کرسکتا ہے۔ ہاں اپنے ممدوح کے لیے کوئی بھی شخص دو چار جملے نہ چاہتے ہوئے بھی رقم کرڈالتا ہے۔ یہ تہذیب کا ایک حصہ ہے۔

علی عباس صاحب نے انہیں معروضات میں ''فسانۂ خورشیدی'' کو محض ایک رومانی ناول کہا ہے۔ ہم یہاں بھی حد ادب کے ساتھ ان سے اختلاف کرتے ہیں ۱۸۸۵ء میں لکھے جانے والے اس ناول کو ''محض رومانی'' کہنا اس پر ظلم کے مترادف ہوگا۔ یہ ناول روشن خیالی کی قدروں کو بڑھاوا دیتا ہے۔ ترقی پسند لہروں سے مملو ہے اور اس کی اساس عورت کی Emancipation ہے، یہی اس ناول کا اسٹرکچر بھی ہے اور اس لحاظ سے یہ ناول سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست اپنی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' مطبوعہ نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد دکن کے صفحہ ۲۷ پر رقم طراز ہیں:

> ''نذیر احمد اور سرشار کے معاصرین میں حالؔی، شاد عظیم آبادی اور افضل الدین کے نام قابل ذکر ہیں لیکن ان ناول نگاروں نے اردو ناول کو کسی نئی روایت سے روشناس نہیں کیا۔ ان کی کوششیں تمام تر تقلیدی ہیں جیسا کہ علی عباس حسینی اور وقار عظیم کا بھی خیال ہے''

میرا خیال ہے کہ جناب یوسف سرمست نے علی عباس حسینی اور وقار عظیم صاحب کی آرا پر انحصار کیا ہے۔ ورنہ اگر وہ خود شاد عظیم آبادی کے ناول ''صورت الخیال عرف ولایتی بیگم'' افیونی اور بدھاوا کو، اور افضل الدین کے ناول فسانۂ خورشیدی کو نظر سے گزارے ہوتے تو ان کی رائے بدلی ہوئی ہوتی۔ میرے خیال کو تقویت اس وجہ سے پہنچتی ہے کہ یوسف سرمست صاحب نے ڈپٹی نذیر احمد کے تمام ناولوں پر تفصیل سے گفتگو کی اور ان دونوں حضرات کے ناولوں کا نام لینا بھی گوارا نہ کیا۔ اور تقلید کا الزام تھوپ کر گزر گئے اگر یوسف سرمست صاحب اردو ناقدین کی ان آراء سے مستفید ہوتے جن میں کہا گیا ہے

کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' وغیرہ پر انگریزی ناولوں کے اثرات ہیں اور شاد عظیم آبادی کے ناول صورت الخیال پر بنگلہ ناولوں کے اثرات ہیں تو پھر دونوں طرح کے ناولوں کے قبلہ میں مغرب و مشرق کے بعد کا فرق سمجھ میں آ جاتا۔

ہمارے محققین میں اکثر کا رویہ یہی رہا ہے کہ وہ لکھے کو لکھتے جاتے ہیں دوسروں کی آراء پر انحصار کرتے ہیں، اصل کتب تک یا تو ان کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے یا تن آسانی اور آلکسی آڑے آجاتی ہے ورنہ اس قسم کے رواں جملے سے کام نہیں چلایا جاتا کہ ''علی عباس حسینی اور وقار عظیم کا بھی یہی خیال ہے''۔

مراۃ العروس دہلی میں بیٹھ کر ۱۸۶۹ء کے آس پاس لکھا گیا ہے، ''صورت الخیال'' ۱۸۷۶ء میں اور ''فسانۂ خورشیدی'' ۱۸۸۵ء کے آس پاس پٹنے اور کلکتہ میں معرض وجود میں آتے ہیں۔ اور مرزا غالب (۲۹۔۱۸۲۸ء) کے کلکتہ کو دیکھ کر ہی اس کے نئے پن پر فریفتہ ہوئے جا رہے تھے۔ ناول ''فسانۂ خورشیدی'' غالب کی آمد کے نصف صدی کے بعد سپرد قلم ہوا جب کلکتہ کا نیا پن بہت نمایاں ہو چکا تھا۔ اس کا سماج بھی اس نئے پن کا اثر لیے بغیر نہ رہ سکا تھا، ظاہر ہے ''فسانۂ خورشیدی'' کلکتے میں تیزی سے بدلتی ہوئی اقدار کی بساط پر رقم ہوا ہے، اسے بدلتی ہوئی صورت حال کا اثر لینا ہی چاہیے تھا۔ بنگلہ زبان میں ناول نگاری پختہ عمر کو پہنچ چکی تھی۔ بہ قول سی آر داس بنگال جو کچھ آج سوچتا تھا باقی ہندوستان پچاس برس بعد سوچتا تھا۔ مسلمان صاحبان علم وفکر و فلسفہ اشاعرہ کے فکر کے دائرۂ اثر سے نکل کر معتزلہ کی عقل پرستی کے حیطے میں قدم رکھ رہے تھے اور عقل کو سبقت حاصل ہوتی جاتی تھی، عقیدہ اور عقل کی اس دوڑ میں! اس صورت حال میں ڈاکٹر یوسف سرمست یا ان کے پیش رو ناقدین کا فسانۂ خورشیدی پر ایک چلتا پھرتا ریمارک پھینک کر یا پیش رووں کی باتوں کو صاد کر کے یا انھیں نقل کر کے گزر نا بعید از انصاف عمل ہے۔ یہ کام تو سنجیدہ محاکے کا طلب گار ہے، کھلا ذہن اور راست فکری چاہتا ہے۔

ان باتوں کے برعکس ''فسانۂ خورشیدی'' کو نئی روشنی کا ناول تسلیم کر کے ڈاکٹر

سیمیں ثمر فضل اپنے مقالے ''ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ'' میں لکھتی ہیں:

''افضل الدین بذات خود ایک روشن خیال اور جدید تعلیم کی خوبیوں سے آراستہ شخص تھے۔ وہ جدید تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو سمجھتے تھے۔ انھیں انگریزی زبان وادب سے کافی دلچسپی تھی۔ ترقی پسندی اور روشن خیالی انھیں اپنے ورثے میں ملی تھی کیوں کہ ان کے والد امیر علی خود اپنے عہد کی ممتاز شخصیتوں میں شمار کیے جاتے تھے............''

فسانۂ خورشیدی کی حصول یابی اور اس کے بہ غائر مطالعے کے بعد ایسے ناقدین کی جستجو میں میری نظر ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل اور ڈاکٹر آصفہ واسع کی تحاریر پر پڑی۔ ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل کے حوالے اوپر دیے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر آصفہ نے اپنی کتاب بہار میں اردو ناول نگاری میں الگ الگ باب قائم کر کے اس صوبہ کے ابتدائی ناولوں کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۵۰ء کے بعد سے ۱۹۱۱ء تک کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ ایک باب افضل الدین احمد کے ناول ''فسانۂ خورشیدی'' کے لیے بھی قائم کیا گیا ہے۔ یہ باب دوسرے ناولوں کے ذکر کے مقابلے میں نسبتاً جامع اور تفصیلی ہے اور ناول اور اس کے مصنف کے بارے میں بڑی وضاحت سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس میں جو چیز میرے حلق سے پار نہ ہو سکی وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر آصفہ نے اپنے مضمون کے آخر میں علی عباس حسینی کا موقف نقل کر دیا ہے:

''بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صورت الخیال اور فسانۂ خورشیدی دن کے چاند کی طرح ''فسانۂ آزاد'' کی چمک کے آگے پھیکے پڑ گئے ورنہ مجموعی حیثیت سے انیسویں صدی کے ناولوں میں دونوں تصنیفات ایک ممتاز جگہ پانے کے مستحق ہیں''

یہ بات علی عباس حسینی صاحب اس وقت لکھ رہے تھے جب ''فسانۂ آزاد''

کی عبارت آرائی یعنی مقفٰی، مرصع اور مسجع تحریریں تقریباً متروک ہو چکی تھیں۔ سادہ کاری اور سادہ نویسی کا دور دورہ تھا اور اردو کے بہت بڑے افسانہ نگار غلام عباس نے شہزاد منظر سے ایک گفتگو کے دوران ''صورت الخیال'' کو جدید ناول کا نقطۂ آغاز گردانا ہے۔ اس بارے میں اختر حسین رائے پوری نے بھی کچھ اسی نوع کے خیال کا اظہار کیا ہے۔ دونوں اپنے وقت کے اہم فکشن نگار اور اس کے پارکھ ہیں۔

فسانۂ آزاد میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ لکھنؤ کے ایک خاص عہد کی زبان ہے اور ایک خاص کلچر کی نمائندگی کرتی ہے، اسے انڈو ایرانی کلچر کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ عبدالغفور شہباز ''اردو نثر کو مسجع و مقفٰی کرنے کی روش کو عربی ایرانی کہتے ہیں''۔ فسانۂ آزاد (از رتن ناتھ سرشار) اسی طرز سخنوری کا نمونہ ہے، یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شہباز کی تقریظ کے کچھ حصے کو نقل کر دیا جائے تا کہ ہمارے موقف کو بھی تقویت ملے اور قارئین حضرات تک تقریظ کے متن کا ایک حصہ اصل صورت میں پہنچ جائے:

''.......... یہ خیال ابتدا میں عرب والوں کا تھا۔ ان سے وسط ایشیا والوں نے لیا اور وسط ایشیا والوں سے اردو سخنوروں: ولؔی، میرؔ، سوداؔ، ناسخؔ، آتشؔ، مصحفؔی، دردؔ، ذوقؔ، مومنؔ وغیرہ نے جو کچھ کہا پابندیٔ وزن سے کہا۔ نثر کو اپنی کسر شان اور خلاف رتبہ سخنوری سمجھے۔ انگریزوں کی حاجتوں اور کوششوں نے باغ و بہار، آرائش محفل، قصۂ گل بکاؤلی اور اخلاق ہندی وغیرہ کتابیں تصنیف کرا کے نثر میں سخنوری کی ہدایت کی، چنانچہ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے فسانۂ عجائب، فسانۂ عبرت گلزار سرور وغیرہ کتابیں لکھ کر نثر اردو میں سخن وری یعنی نثاری کی بنیاد مستحکم طور پر قائم کر دی۔ مگر ساتھ ہی ان کی طرز عبارت کی دقت اور مطالب کی پیچیدگی نے بالطبع لوگوں کو یہ سبق بھی دیا کہ نثر میں ضائع بدائع کی قید سخت اصل مطالب میں بڑا فتور ڈالتی ہے۔ میں اس

وقت جب کہ صاحب ''فسانہ'' کی تصانیف فن قافیہ سنجی اور رعایت لفظی میں اپنے جوہر دکھا رہی تھیں، غالب کے اردوئے معلیٰ نے شاہ جہان آباد (دہلی) میں جلوہ گر ہو کر سہل ممتنع میں قافیہ پیائی کا رستہ بتایا اور بے تکلف بامحاورہ سیدھی سادی نثر لکھنے کا ڈھنگ سکھایا..........''

یہاں میرا مؤقف یہ ہے کہ اول تو محترمہ آصفہ کو علی عباس حسینی کی اس رائے کو اپنے جائزے کا اختتامیہ بنانے کے بجائے کچھ اپنے انداز میں رقم کرنا چاہیے تھا تاکہ یہ معلوم ہو سکتا کہ ان کی نسل کے مقالہ نگار نے فسانۂ خورشیدی کی تفہیم کس طرح کی ہے اور ان کا اخذ نتیجہ (بشمول ڈاکٹر آصفہ) کیا ہے۔ لیکن محترمہ نے ایسا نہ کر کے مرقوم حسینی صاحب کی عبارت پر اکتفا کی۔ بے شک اختتام کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اپنے مؤقف کا بیان کسی بزرگ کی آراء پر محمول کر دیا جائے۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ مقالہ نگار اچھی یا بری اپنی آراء اور اخذ نتائج پر انحصار کرے کیونکہ وہی اپنے عہد کا شارح ہوتا ہے۔ اس سے سو برس پہلے کے لوگوں کی طرح سوچنے کی توقع کرنا، الٹی چال چلنے کے مترادف ہے۔ محترمہ ڈاکٹر آصفہ واسع اب ایسی بھی عاجز رقم نہیں کہ اپنی آراء کے لیے شایان شان اختتامیہ رقم نہیں کر سکتی تھیں جبکہ ۲۶ صفحات اپنی کتاب میں فسانۂ خورشیدی کے لیے مختص کیے ہیں۔

اگر علی عباس حسینی کی مرقومہ عبارت میں ''چمک دمک'' سے مراد وہ عبارت آرائی اور آرائشِ لب ولہجہ اور شاعرانہ بیان ہے جو فسانۂ آزاد کا خاصہ ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اسے سرسید تا مولوی عبدالحق کب کا ترک کر چکے تھے۔ اور بے شک صورت الخیال اور فسانۂ خورشیدی اس طرز اظہار سے مبرا ہیں۔ اگر ان کے مصنفین ''فسانۂ آزاد'' کا ڈسکورس اپناتے تو اس کی نباہ بھی نہیں ہوتی اور بڑا مصنوعی طرز عمل نظر آتا۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے محققین و نقاد کسی دور کے ناول پر بات کرتے ہوئے نہ صرف اس دور اور اس میں موجود صورت حال کو ذہن میں نہیں رکھتے بلکہ اس وقت کے

تمام تقاضوں کو بھی بھلا دیتے ہیں اور کھینچ تان کر اسے ہر دور پر پھیلانے کی سعی فرماتے ہیں۔فسانۂ خورشیدی جس وقت لکھا گیا وہ یقیناً ۱۸۸۵ء کے اردگرد کے مہ و سال تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو ناول قدم نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔مراۃ العروس اور اس قبیل کے دیگر ناولوں کے دور میں شاد کا ناول صورت الخیال تازہ ہوا کی مثال تھا۔''فسانۂ خورشیدی'' تو اس سے بھی پندرہ بیس سال بعد کا ناول ہے۔ظاہر ہے ''صورت الخیال'' اور ''فسانۂ خورشیدی'' کی ماجرا کاری اور فضا بندی کا قبلہ انگریزی کا پہلا ناول ''ڈان کوئیک زوٹ'' یا اسی قبیل کے دیگر معاصر ناول نہیں ہو سکتے تھے۔ان کا قبلہ بنگلہ سر زمین اور اس زبان میں لکھے گئے ناولوں کے تجربے تھے۔

اس پس منظر میں ناول ''فسانۂ خورشیدی'' بلاشبہ اگلے قدم ہی کے مترادف تھا اور حقوق نسواں، تعلیم نسواں کے فروغ کی مساعی کے باب میں Renaissance کے درجے پر فائز تھا۔

اگر ہم سہل اور سادہ نثر لکھنے کی اس تحریک کو جو گلکرسٹ کی قیادت میں میر امن اور ان کے دوسرے رفقا کے توسط سے فورٹ ولیم کلکتہ (۱۸۰۰ء) سے شروع ہوئی اور جو غالب، سرسید، حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی عبدالحق تک آتے آتے نکھار پر آ گئی، بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی نثر میں فارسی اضافت کے استعمال سے بھی ممکنہ حد تک احتراز روا رکھنے کی سعی کی اور خالص اردو کی شکل و صورت کو اجاگر کیا۔یہی طرز نثر Verdict of the day کے درجے پر فائز ہوئی۔پھر نثر کے اس بتدریج ارتقاء کی روشنی میں اگر ''فسانۂ خورشیدی'' کی نثر کو صاف، با محاورہ اور بامزہ ہونے اور پیش روؤں کی سلیس اردو نثر لکھنے کی ادبی حلقوں میں توصیف ہوئی تو یہ خوش ہونے کا مقام تھا چہ جائیکہ علی عباس حسینی نے ''فسانۂ آزاد'' سے فسانۂ خورشیدی کا مقابلہ شروع کر دیا۔اور پھر یہ جملے بھی لکھے کہ ''فسانۂ خورشیدی'' فسانۂ آزاد کے مقابل میں دن کا چاند ہے۔جب کہ انھیں پتا تھا کہ دونوں زیر بحث ناول جس آب و ہوا، ماحول اور

تہذیب کے زیر اثر لکھے گئے ، بالکل جدا گانہ تھے، اور ان کے پیش رو بزرگ ''فسانہ آزاد'' کی مخصوص زبان اور عبارت کی ادائیگی کو بھی رد کر چکے ہیں اور ایک نئی نثر کی داغ بیل ڈالی ہے۔

اس طویل بحث کو سمیٹتے ہوئے میں صرف یہی کہوں گا کہ ''فسانہ آزاد'' کے مقابلے میں ''فسانہ خورشیدی'' کی نثر دن کا چاند نہیں بلکہ اردو ناول کی دنیا میں طلوع آفتاب کا منظر نامہ ہے، وہی جو ہر روز مشرق سے ابھرتا ہے۔

مالن　　نرگس

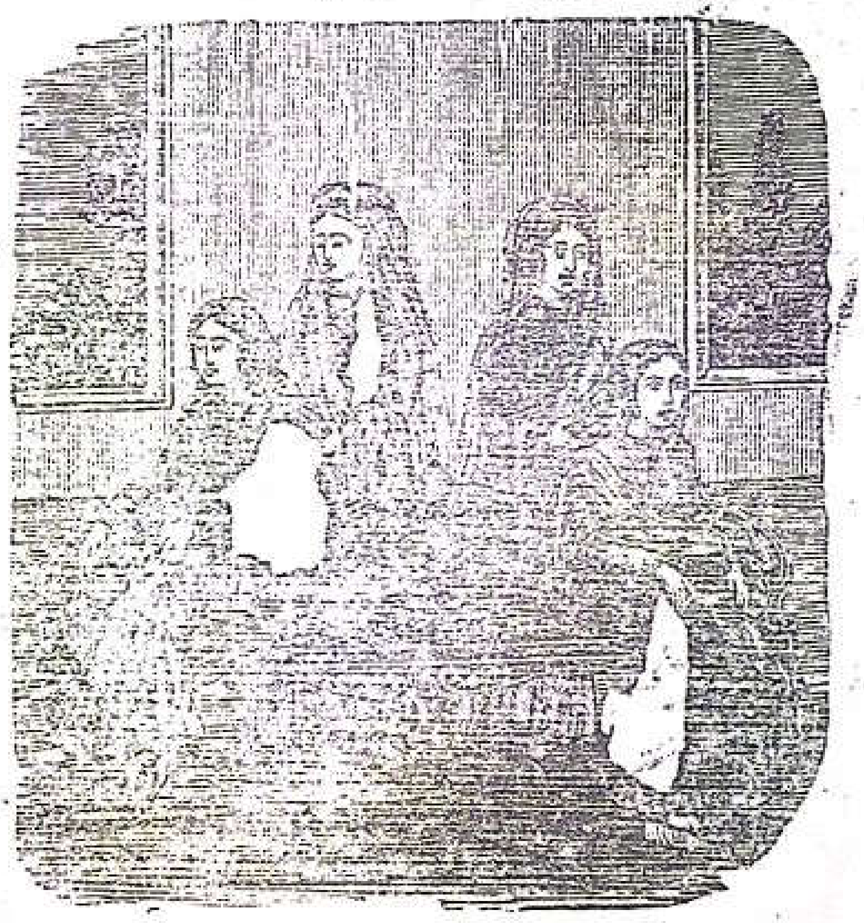

مشتری بیگم　　خورشید بدری بیگم

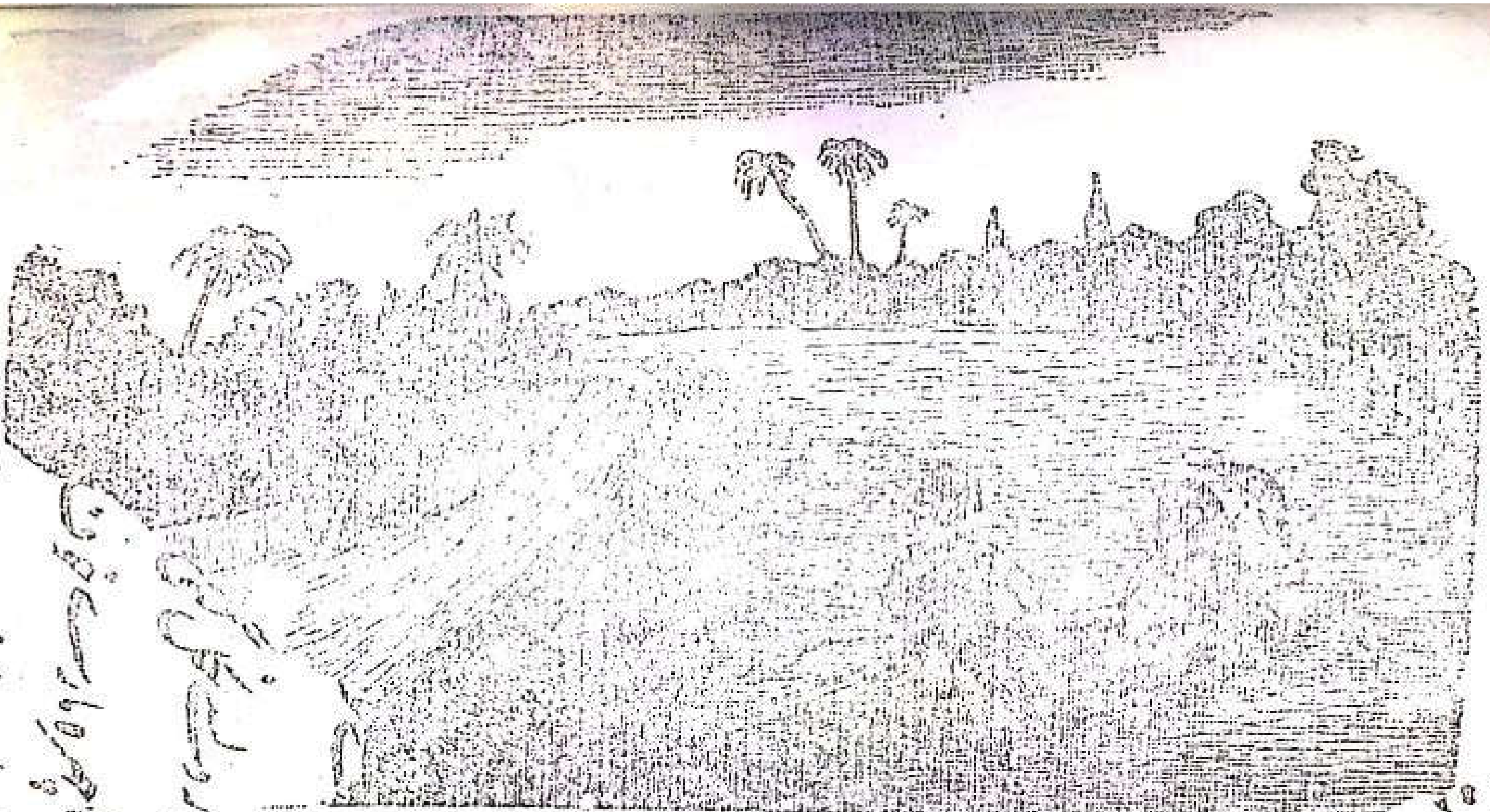

اور سو فٹ پیچھے خورشید بیگم نواب آسمان شاہ

او شہر یار دلے سے نکل گئی
بی بالوں کا چہرہ مارے خوف
شہتری میں بیگم الگ ششدر و مضطر کہ
دیکھتی رہ گئیں کہ یہ ان کا گزرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیونکر مقبول ہو مری تحریر / [illegible]

اوس کی قدرت بیان سے باہر ہے / بند ہے اس جگہ لب تقریر

عندلیبان گلشن فطرت / ہیں یہاں مثل بلبل تصویر

کیسا صانع ہے جسکی صنعت سے / بے ستون آسمان کی ہے تعمیر

نور پھیلا ہوا ہے عالم میں / چرخ پر جلوہ گر ہے سعد کبیر

آسمان جاہ ہے کوئی انسان / کوئی خورشید پر ضیا کی نظیر

ہے کوئی مشتری کوئی زہرہ / ہے کوئی بے نظیر و بدر منیر

سب کے احوال اوسپہ روشن ہیں / ہے بلا ریب وہ علیم و خبیر

اوسکے محبوب کا وہ رتبہ ہے / آپ جس کو کہا بشیر و نذیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نواب حشمت الدولہ بہادر قصر عالی کا ایک دلچسپ

خضر پور کے پل کے [illegible] سڑک پر۔ کوئی دس بیس قدم
پیچھے ہٹ کر۔ لب دریا ایک مکان فرحت توامان جس کے آگے قصور
بہشتی سر جھکاتے ہین اور ایک شاہی شہ نشین نہایت سج دھج سے
سر بفلک ہے۔ اوس مین ایک چھپے کمرے مین پانچ شخص متمکن تھے
فرش نہایت تکلف سے بچھا ہوا تھا۔ موقع موقع سے چھت مین ہانڈیان لٹکی ہوئی تھین
قمقمے سرخ و سبز و زنگاری آویختہ تھے۔ وقت روشنی اون کی چمک
دمک آنکھون کو خیرہ بلکہ ماہ و پروین کو تیرہ کرتی تھی۔ چار بیش بہا نہایت
صاف و شفاف طلائی چوکھٹون مین جڑے ہوئے بڑے بڑے حلبی
آئینے دیوارون سے آویزان تھے۔ اون کے عکس سے کمرہ مثل